OPEN ACCESS: Al-Aijaz Research Journal of Islamic Studies & Humanities
ISSN (ONLINE): 2707-1219 & ISSN (PRINT): 2707-1200
http://www.arjish.com

دینی مدارس کے فضلاء کی معاشی خود کفالت اور معاشرتی کردار: اسلامی تعلیمات اور ضلع سوات کے تناظر میں

Economic Self-Reliance and Social Role of Madrasa Graduates: An Islamic Perspective with Special Reference to District Swat

Mazhar Uddin
M.Phil in Islamic Studies, Department of Islamic & Arabic Studies,
University of Swat
Email: mazharuddinmazhari@gmail.com

Dr. Yahya Khan
Assistant Professor, Department of Islamic & Arabic Studies,
University of Swat
Email: yahya@uswat.edu.pk

Received on: 05-10-2025 Accepted on: 15-11-2025

Abstract

Religious seminaries (Madaris) have remained the backbone of Islamic learning in the Indian subcontinent, and the scholars they produce occupy a central place in the moral and social life of Muslim society. Yet the economic condition of these graduates has seldom been studied in a systematic manner. This article examines the economic self-reliance and social role of madrasa graduates in the light of the Qur'an, the Sunnah and the practice of the Companions and the early scholars, and then applies this framework to the graduates of the religious seminaries of District Swat who completed their studies between 2001 and 2005. Drawing on a qualitative study based on face-to-face interviews, the article shows that most graduates depend on Imamat, Khitabat and teaching as their main sources of income, that a number of them have attempted trade and small business, and that their social standing remains high in matters such as dispute resolution, family decisions and the reform of un-Islamic customs. The study identifies the lack of technical and vocational skills, the absence of economic training in the madrasa curriculum, limited local employment opportunities and certain social attitudes as the principal causes of economic weakness. It concludes that the Islamic concept of lawful earning (Kasb-e-Halal) offers a dignified path, and proposes practical measures such as skill-based courses within madaris, fixed salary structures for religious services, and the promotion of trade and entrepreneurship among graduates, so that the scholars may perform their religious and social duties with peace of mind.

Keywords: Madaris, madrasa graduates, Islamic economics, Kasb-e-Halal, District Swat, social role.

تمہید

اسلام میں علم اور اہلِ علم کو جو مقام حاصل ہے وہ کسی وضاحت کا محتاج نہیں۔ اسلام کی پہلی درسگاہ "صُفّہ "مسجدِ نبوی کے ایک چبوترے پر قائم ہوئی جہاں نادار مگر علم کے شیدائی صحابہ کرامؓ براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دین سیکھتے تھے، اور وہیں سے اس تعلیمی سلسلے کا آغاز ہوا جو آج دینی مدارس کی صورت میں پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ قرآنِ کریم نے اہلِ علم اور غیر اہلِ علم کے درمیان واضح امتیاز قائم کرتے ہوئے فرمایا:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ[1]

ترجمہ: کہہ دیجیے کیا علم والے اور بے علم برابر ہو سکتے ہیں؟

اور زندگی کا ایک اہم مقصد خشیتِ الٰہی ہے، قرآنِ کریم نے اس کا حقیقی مصداق علماء ہی کو قرار دیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ[2]

ترجمہ: اللہ سے اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علماء کو انبیاء کا وارث قرار دیتے ہوئے فرمایا:

"إِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ، وَإِنَّ الْأَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوا دِينَارًا وَلَا دِرْهَمًا، وَرَّثُوا الْعِلْمَ"[3]

یعنی علماء انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاء نے درہم و دینار کی میراث نہیں چھوڑی بلکہ علم کی میراث چھوڑی ہے۔ اس حدیث سے جہاں علماء کے بلند مقام کا اندازہ ہوتا ہے وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کی اصل وراثت علم اور ہدایت ہے، اور اس وراثت کی حفاظت و اشاعت کی ذمہ داری انہی کے کندھوں پر ہے جو اس علم کے حامل ہیں۔

معاشرے کے بناؤ اور بگاڑ میں علماء کا کردار انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ علماء اگر اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے سے انجام دیں تو معاشرہ حقیقی معنوں میں اسلامی خطوط پر گامزن ہوتا ہے۔ برائیوں کے قلع قمع، اجتماعی و اخلاقی اقدار کی تشکیل اور مثبت رجحانات کی تعمیر میں علماء کرام سب سے زیادہ مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں، اور ایک پرامن، تعمیری اور ترقی یافتہ معاشرے کی تشکیل بھی علماء کرام ہی بہتر انداز میں کر سکتے ہیں۔ کیونکہ معاشرہ ہی وہ جگہ ہے جہاں سے مختلف خیالات اٹھتے ہیں، مختلف کردار نمودار ہوتے ہیں اور مختلف رسم و رواج کا چلن ہوتا ہے۔ بالخصوص معاملات کا باب، جو گزرانِ زندگی کا ایک اہم شعبہ ہے، سراسر معاشرے ہی سے جنم لیتا ہے۔ جہاں کہیں معاشرہ کسی خاص فکری و تعلیمی منہج کے تحت پل رہا ہو وہاں کے سارے معاملات اسی منہج پر استوار ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر کسی معاشرے کو بہترین منہج پر گامزن رکھنا

ہو تو وہاں علماء کا وجود جسم میں سر کی حیثیت رکھتا ہے، تاکہ معاشرے کے سارے معاملات، رسم و رواج اور کردار و چلن دنیاوی تقاضوں کے ساتھ ساتھ اسلامی احکام سے روگرداں نہ ہوں۔

تاہم یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ عالم اپنی یہ ذمہ داری اسی وقت بہتر طور پر نبھا سکتا ہے جب وہ معاشی طور پر خود کفیل اور ذہنی طور پر یکسو ہو۔ دورِ حاضر میں معیشت کی اہمیت سے انکار کی قطعاً گنجائش نہیں۔ ایک زمانہ تھا جب دفاعی قوت کو اصل قوت تصور کیا جاتا تھا، جبکہ آج اس کی جگہ معیشت نے لے لی ہے۔ اگر کوئی ملک معاشی لحاظ سے طاقتور ہے تو حقیقت میں اسی کو طاقتور مانا جاتا ہے۔ جب معیشت کا اجتماعی زندگی پر اتنا گہرا اثر ہے تو لازمی بات ہے کہ فرد کی زندگی پر اس کا اثر اس سے بھی زیادہ گہرا ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ سے لے کر ائمہ مجتہدین تک اکابرینِ امت تجارت اور دیگر جائز ذرائعِ معاش اختیار کرتے رہے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے رہے۔

اسلام صرف تبلیغ یا عبادات کا نام نہیں بلکہ معاملات اور کاروباری زندگی کو اسلامی اصولوں کے مطابق گزارنا بھی عین عبادت ہے۔ علماء کرام بھی اسی معاشرے کا حصہ ہیں اور ان کا کام زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی رہنمائی کرنا ہے۔ اسی پس منظر میں یہ سوال نہایت اہم ہو جاتا ہے کہ دینی مدارس سے فارغ ہونے والے فضلاء کی معاشی حالت کیا ہے، وہ کن ذرائع سے روزی کماتے ہیں، انہیں کن مشکلات کا سامنا ہے، اور معاشرے میں ان کا مقام و کردار کیا ہے؟ زیرِ نظر مقالے میں انہی سوالات کا جائزہ قرآن و سنت اور اسلاف کے طرزِ عمل کی روشنی میں لیا گیا ہے، اور ضلع سوات کے ان فضلاء کو بطورِ نمونہ پیش کیا گیا ہے جو 2001ء سے 2005ء کے دوران مختلف دینی مدارس سے فارغ التحصیل ہوئے۔ یہ مطالعہ معیاری (Qualitative) منہجِ تحقیق پر مبنی ہے جس میں ان فضلاء سے بالمشافہ انٹرویو کیے گئے اور ان کے ذرائعِ آمدن، کاروباری کوششوں، ماہانہ اخراجات، معاشی منصوبہ بندی، درپیش مشکلات اور معاشرتی کردار کا جائزہ لیا گیا۔ یہ دورانیہ اس لیے منتخب کیا گیا کہ اس کے بعد تقریباً بیس برس کا عرصہ گزر چکا ہے جس میں کسی فرد کا معاشی کردار پوری طرح واضح ہو کر سامنے آ جاتا ہے، اور یہ اختصار اس لیے بھی اختیار کیا گیا تاکہ موضوع میں غیر ضروری طوالت پیدا نہ ہو۔

معیشت کا مفہوم اور اسلام میں کسبِ حلال کا مقام:

لفظ "معیشت" عربی مادہ "ع ی ش" سے ماخوذ ہے جس کے معنی زندگی گزارنے اور زندگی کے اسباب و وسائل کے ہیں۔ "عیش" زندگی کو کہتے ہیں اور "معیشت" وہ ذریعہ ہے جس سے زندگی بسر کی جائے۔ قرآنِ کریم میں بھی "معایش" کا لفظ اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے:

وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ[4]

ترجمہ: اور ہم نے تمہیں زمین میں ٹھکانا دیا اور اس میں تمہارے لیے زندگی کا سامان بنایا، تم بہت کم شکر کرتے ہو۔

اصطلاحی طور پر علامہ ابن خلدون معاش کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ معاش رزق کی طلب اور اس کے حصول کی کوشش کا نام ہے۔[5] ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں معاش کے فطری ذرائع کو زراعت، صنعت اور تجارت میں تقسیم کیا ہے اور انسانی تمدن کے ارتقاء کو انہی ذرائع کے ساتھ جوڑا ہے۔ جدید معاشیات کے بانی سمجھے جانے والے آدم سمتھ کے نزدیک معاشیات کا مقصد لوگوں کے لیے وافر آمدنی اور گزر بسر کا سامان مہیا کرنا ہے،[6] جبکہ الفریڈ مارشل (1842ء تا 1924ء) کے مطابق معاشیات انسان کی روزمرہ کاروباری زندگی کا مطالعہ ہے۔[7] ان تمام تعریفات کا حاصل یہ ہے کہ معیشت انسانی زندگی کا ایک بنیادی شعبہ ہے جس سے کوئی فرد، خواہ وہ عالمِ دین ہی کیوں نہ ہو، بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ فرق صرف یہ ہے کہ مغربی معاشیات کا محور مادی منفعت ہے جبکہ اسلامی معاشیات میں معاشی جدوجہد کو اخلاق، حلال و حرام اور آخرت کی جوابدہی کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔

اسلام رہبانیت کا دین نہیں بلکہ دین و دنیا دونوں میں توازن کا داعی ہے۔ قرآنِ کریم نے جمعہ جیسی اہم عبادت کے فوراً بعد رزق کی تلاش کا حکم دیا:

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللَّهِ وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ[8]

ترجمہ: پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل (رزق) تلاش کرو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

اس آیتِ مبارکہ میں رزق کی تلاش کو "فضلِ الٰہی" سے تعبیر کیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حلال روزی کمانا اللہ کے فضل کی جستجو ہے، اور اس جستجو کے ساتھ ذکرِ الٰہی کا حکم دے کر یہ بتا دیا گیا کہ معاشی سرگرمی اور اللہ کی یاد ایک دوسرے کے منافی نہیں۔ ایک اور مقام پر زمین کو انسان کے لیے مسخر قرار دے کر اس میں چلنے پھرنے اور رزق کھانے کی ترغیب دی گئی:

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِن رِّزْقِهِ وَإِلَيْهِ النُّشُورُ[9]

ترجمہ: وہی ہے جس نے زمین کو تمہارے تابع کر دیا، پس اس کے راستوں میں چلو پھرو اور اس کا دیا ہوا رزق کھاؤ، اور اسی کی طرف دوبارہ اٹھ کر جانا ہے۔

اور یہ اصول بھی بیان فرما دیا کہ انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے: "وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ"۔[10] قرآنِ کریم نے انبیاء کرام علیہم السلام کے پیشوں کا ذکر بھی فرمایا ہے؛ حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی بنانے کا حکم دیا،[11] حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے لوہے کو نرم کر کے زرہیں بنانے کا فن سکھایا،[12] اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت شعیب علیہ السلام کے ہاں کئی برس اجرت پر کام کیا۔[13] ان واقعات سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ محنت اور ہنر سے روزی کمانا انبیاء کی سنت ہے اور اس میں کوئی عار نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ کی کمائی کو بہترین کمائی قرار دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:
مَا أَكَلَ أَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِنْ أَنْ يَأْكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدِهِ، وَإِنَّ نَبِيَّ اللَّهِ دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ يَأْكُلُ مِنْ عَمَلِ يَدِهِ[14]

ترجمہ: کسی نے اپنے ہاتھ کی کمائی سے بہتر کھانا کبھی نہیں کھایا، اور اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے۔

دیانت دار تاجر کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ عظیم بشارت دی:
التَّاجِرُ الصَّدُوقُ الأَمِينُ مَعَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ[15]

ترجمہ: سچا اور امانت دار تاجر (قیامت کے دن) انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہو گا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کرنے اور دوسروں پر بوجھ بننے کو سخت ناپسند فرمایا۔ ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کوئی رسی لے کر لکڑیوں کا گٹھا اپنی پیٹھ پر لاد کر لائے اور اسے بیچے، اور اللہ اس کے ذریعے اس کی آبرو بچالے، یہ اس کے لیے لوگوں سے مانگنے سے بہتر ہے، خواہ وہ اسے دیں یا نہ دیں۔[16] اسی طرح فرمایا: "اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلَى "یعنی اوپر والا (دینے والا) ہاتھ نیچے والے (لینے والے) ہاتھ سے بہتر ہے۔[17] اس سلسلے میں ایک نہایت سبق آموز واقعہ حدیث کی کتابوں میں منقول ہے کہ ایک انصاری صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سوال کرنے کے لیے حاضر ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ تمہارے گھر میں کچھ ہے؟ عرض کیا: ایک ٹاٹ ہے جس کا کچھ حصہ ہم اوڑھتے اور کچھ بچھاتے ہیں، اور ایک پیالہ ہے جس میں پانی پیتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں چیزیں منگوا کر صحابہ کرامؓ کے سامنے نیلام فرمائیں اور دو درہم میں فروخت کر دیں۔ ایک درہم سے گھر والوں کے لیے کھانا خریدنے کا حکم دیا اور دوسرے درہم سے کلہاڑی خرید کر اس میں اپنے دستِ مبارک سے دستہ لگایا اور فرمایا: جاؤ لکڑیاں کاٹو اور بیچو، اور پندرہ دن تک میں تمہیں نہ دیکھوں۔ وہ صحابی پندرہ دن بعد آئے تو دس درہم کما چکے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ تمہارے لیے اس سے بہتر ہے کہ قیامت کے دن سوال کا داغ تمہارے چہرے پر ہو۔[18] یہ واقعہ اس بات کی روشن دلیل ہے کہ اسلام نے معاشی مسئلے کا حل محض صدقہ و خیرات میں نہیں بلکہ ہنر، محنت اور خود انحصاری میں تلاش کیا ہے۔

اسلام نے معاشی سرگرمیوں کو چند بنیادی اصولوں کا پابند بنایا ہے جن کی پاسداری ہر مسلمان، بالخصوص عالمِ دین کے لیے ضروری ہے۔ ان میں سب سے پہلا اصول حلال و حرام کی تمیز ہے، کیونکہ کمائی کے ذرائع کا حلال ہونا اسلامی معیشت کی اولین شرط ہے۔ دوسرا اصول سود کی حرمت ہے؛ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا"[19] یعنی اللہ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے۔ تیسرا اصول اسراف و تبذیر کی ممانعت ہے: "وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا"[20] یعنی کھاؤ پیو مگر حد سے تجاوز نہ کرو۔ چوتھا اصول ارتکازِ دولت کی ممانعت ہے تاکہ

دولت معاشرے کے تمام طبقات میں گردش کرتی رہے: "كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ"۔[21] اور پانچواں اصول عدلِ اجتماعی ہے، جس کے تحت اسلام شخصی ملکیت کا حق تسلیم کرتے ہوئے زکوۃ، صدقات، عشر اور وراثت کے ذریعے معاشرے کے کمزور طبقات کی کفالت کا انتظام کرتا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیہارویؒ کے مطابق اسلام کا اقتصادی نظام نہ تو سرمایہ داری کی طرح فرد کو بے لگام چھوڑتا ہے اور نہ اشتراکیت کی طرح اس کی ملکیت چھینتا ہے، بلکہ حدود اللہ کے اندر شخصی ملکیت کا اثبات کرتے ہوئے عدل و توازن قائم کرتا ہے۔[22] شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے بھی "حجۃ اللہ البالغہ" میں "ارتفاقات" کے عنوان سے انسانی تمدن کے معاشی مراحل پر تفصیلی بحث کی ہے اور واضح کیا ہے کہ جب معاشرے کے افراد پر معاشی دباؤ حد سے بڑھ جائے تو ان کے اخلاق بھی بگڑ جاتے ہیں۔[23]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرامؓ اور اسلاف کی معاشی زندگی:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ معاشی زندگی کے لیے بھی بہترین نمونہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکی زندگی کے ابتدائی دور میں اجرت پر اہلِ مکہ کی بکریاں چرائیں،[24] اور جوانی میں تجارت کا پیشہ اختیار فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دیانت و امانت کا شہرہ سن کر حضرت خدیجہؓ نے اپنا مالِ تجارت آپ کے سپرد کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا سامان لے کر شام تشریف لے گئے۔ اس سفر میں آپ کی امانت داری اور تجارتی مہارت کی بدولت غیر معمولی نفع ہوا، اور یہی دیانت بعد میں حضرت خدیجہؓ کے ساتھ نکاح کا سبب بنی۔[25] اہلِ مکہ آپ کو "الصادق" اور "الامین" کے لقب سے یاد کرتے تھے، اور یہ القاب بڑی حد تک آپ کے تجارتی معاملات کی صداقت اور امانت ہی کا ثمرہ تھے۔ مدنی دور میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھر کی معیشت کا انتظام خود فرمایا؛ ازواجِ مطہراتؓ کا سال بھر کا نفقہ الگ کرتے، اور جو کچھ بچتا اسے اللہ کی راہ میں خرچ فرما دیتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں مسلمانوں کے لیے الگ بازار قائم فرمایا اور خود بازار کا معائنہ فرما کر ملاوٹ اور دھوکہ دہی سے منع فرمایا۔

صحابہ کرامؓ کی ایک بڑی تعداد تجارت، زراعت اور محنت مزدوری سے وابستہ تھی۔ مہاجرین عموماً تجارت پیشہ تھے جبکہ انصار کی اکثریت کھیتی باڑی اور باغبانی کرتی تھی۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کپڑے کے تاجر تھے، اور منقول ہے کہ خلیفہ منتخب ہونے کے اگلے دن بھی کپڑوں کا گٹھا کندھے پر رکھ کر بازار کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں حضرت عمرؓ اور حضرت ابو عبیدہؓ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے عرض کیا کہ اب آپ مسلمانوں کے امور کے ذمہ دار ہیں، اگر آپ تجارت میں مشغول رہے تو امورِ خلافت کون انجام دے گا؟ چنانچہ مشاورت سے بیت المال سے آپ کے لیے ایک معمولی وظیفہ مقرر کیا گیا۔[26] یہ واقعہ اس اصول کی بنیاد بنا کہ جو شخص اپنا پورا وقت دین اور امت کی

خدمت کے لیے وقف کر دے، اس کی معاشی کفالت معاشرے اور بیت المال کی ذمہ داری ہے۔ آج کے دور میں مساجد کے ائمہ، خطباء اور مدارس کے اساتذہ کے مشاہرے کا مسئلہ بھی در حقیقت اسی اصول سے جڑا ہوا ہے۔

حضرت عثمان غنیؓ کا شمار مکہ کے بڑے تاجروں میں ہوتا تھا اور انہوں نے اپنی دولت کو بئرِ رومہ کی خریداری اور جیشِ عسرہ کی تیاری جیسے کاموں میں بے دریغ خرچ کیا۔ حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ جب ہجرت کر کے مدینہ آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا مواخاۃ کا رشتہ حضرت سعد بن ربیع انصاریؓ سے قائم فرمایا۔ حضرت سعدؓ نے انہیں اپنا آدھا مال پیش کیا، مگر حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ نے شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا اور فرمایا: "دُلُّونِي عَلَى السُّوقِ" یعنی مجھے بازار کا راستہ بتا دو۔[27] پھر انہوں نے پنیر اور گھی کی معمولی تجارت سے آغاز کیا اور کچھ ہی عرصے میں مدینہ کے مالدار ترین افراد میں شمار ہونے لگے۔ یہ طرزِ عمل اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ صحابہ کرامؓ دوسروں کے احسان پر جینے کے بجائے اپنی محنت پر بھروسہ کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ فرمایا کرتے تھے کہ تم میں سے کوئی شخص رزق کی تلاش چھوڑ کر بیٹھ نہ جائے اور یہ دعا کرتا رہے کہ اے اللہ مجھے رزق دے، حالانکہ وہ جانتا ہے کہ آسمان سونا اور چاندی نہیں برساتا۔[28]

یہی روایت تابعین اور ائمہ مجتہدین میں بھی پوری آب و تاب کے ساتھ برقرار رہی۔ امام ابو حنیفہؒ ریشمی کپڑے (خز) کے بڑے تاجر تھے اور اپنی تجارت کی آمدنی سے نہ صرف اپنی ضروریات پوری کرتے بلکہ اپنے شاگردوں اور اہلِ علم کی کفالت بھی کرتے تھے۔ ان کے نامور شاگرد امام ابو یوسفؒ کی تعلیم کا خرچ بھی کافی عرصے تک امام صاحبؒ ہی برداشت کرتے رہے۔[29] امام صاحبؒ نے حکومتی عہدے اور وظائف قبول کرنے سے انکار کیا، اور ان کی یہ حق گوئی اور استغناء بڑی حد تک اسی معاشی خود کفالت کی مرہونِ منت تھی۔ مشہور محدث اور زاہد حضرت عبد اللہ بن مبارکؒ بھی بڑے تاجر تھے اور اپنی تجارت کا نفع علماء اور محدثین پر خرچ کرتے تھے۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ تجارت کیوں کرتے ہیں؟ تو فرمایا کہ چند اہلِ علم کی خاطر، تاکہ وہ لوگوں کے محتاج ہوئے بغیر علم کی خدمت کرتے رہیں۔[30] حضرت سفیان ثوریؒ کا یہ قول بھی مشہور ہے کہ اس زمانے میں مال مومن کا ہتھیار ہے، اور اگر یہ دینار نہ ہوتے تو یہ بادشاہ ہمیں رومال بنا لیتے۔[31] یعنی معاشی محتاجی عالم کو اہلِ اقتدار کے دروازے پر لے جاتی ہے اور اس کی آزادیِ رائے چھین لیتی ہے۔

برصغیر کے اکابر علماء کی زندگیاں بھی اس حقیقت کی شاہد ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دہلی کے مطبع میں کتابوں کی تصحیح کا کام کر کے اپنی روزی کمائی اور اسی کو اپنے لیے باعثِ عزت سمجھا۔[32] اسی طرح کئی اکابر نے طباعت، کتابت، زراعت اور تجارت کو ذریعۂ معاش بنایا اور ساتھ ساتھ تدریس و تصنیف کی بے مثال خدمات انجام دیں۔ ان تمام مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ اسلاف

کے ہاں علم اور معاشی خود کفالت میں کوئی تضاد نہ تھا، بلکہ معاشی استغناء علم کی آزادی، حق گوئی اور وقار کا ضامن تھا۔ آج کے فضلاء کے لیے بھی یہی اسوہ بہترین رہنما ہے۔

ضلع سوات: تاریخی و معاشی پس منظر:

سوات صوبہ خیبر پختونخوا کے ملاکنڈ ڈویژن کا ایک خوبصورت پہاڑی ضلع ہے جو اپنے سرسبز میدانوں، دریائے سوات اور بلند و بالا پہاڑی سلسلوں کی وجہ سے "مشرق کا سوئٹزرلینڈ" کہلاتا ہے۔ ضلع کے شمال میں کالام اور اتروڑ کی برف پوش وادیاں ہیں جبکہ جنوب میں ملاکنڈ کا علاقہ واقع ہے۔ مینگورہ اس ضلع کا سب سے بڑا شہر اور تجارتی مرکز ہے جبکہ سیدو شریف انتظامی مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں کی غالب اکثریت پشتو بولنے والی ہے، اور قبائلی روایات، جرگہ نظام اور مہمان نوازی یہاں کی معاشرت کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

سوات کی تاریخ نہایت قدیم ہے۔ یہاں سکندرِ اعظم کی آمد کے آثار ملتے ہیں اور صدیوں تک یہ علاقہ بدھ مت کا اہم مرکز رہا جس کے آثار آج بھی جگہ جگہ موجود ہیں۔ مغلیہ عہد میں بھی اس خطے کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے۔ انیسویں صدی میں حضرت عبدالغفور المعروف سیدو بابا (اخوند صاحبِ سوات) کی روحانی و اصلاحی تحریک نے اس خطے کی دینی شناخت کو مضبوط بنیاد فراہم کی۔ اخوند صاحب نے یہاں شرعی نظام کے قیام کے لیے کوشش کی اور 1849ء میں سید اکبر شاہ کو امیر شریعت مقرر کیا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں سید عبدالجبار شاہ کی مختصر حکومت کے بعد 1917ء میں اخوند صاحب کے پوتے میاں گل عبدالودود (بادشاہ صاحب) حکمران بنے اور انہوں نے ریاستِ سوات کو ایک منظم ریاست کی شکل دی۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادے میاں گل عبدالحق جہانزیب (والی صاحب) نے ریاست کو تعلیم، صحت اور مواصلات کے میدان میں ترقی دی۔ ریاستی دور میں قاضی کورٹس کے ذریعے شریعت کے مطابق تیز رفتار انصاف کا نظام قائم تھا اور ریاست کا مالی نظام زیادہ تر عشر اور زرعی محاصل پر قائم تھا۔ بالآخر 1969ء میں ریاستِ سوات کو پاکستان میں ضم کر دیا گیا۔[33] انضمام کے بعد قاضی عدالتوں کا خاتمہ اور نئے قانونی نظام کا نفاذ اہلِ سوات کے لیے ایک بڑی تبدیلی تھی، جس کے اثرات بعد کے ادوار میں بھی محسوس کیے جاتے رہے۔

سوات کی معیشت کا بڑا انحصار زراعت اور باغبانی پر ہے۔ یہاں گندم، مکئی اور چاول کے علاوہ آڑو، سیب، آلو بخارا اور خوبانی جیسے پھل بڑی مقدار میں پیدا ہوتے ہیں جو ملک کے دیگر حصوں تک بھیجے جاتے ہیں۔ مینگورہ کے قریب زمرد کی کانیں عالمی شہرت رکھتی ہیں، جبکہ دریائے سوات اور اس کے معاون ندی نالے پن بجلی کی پیداوار کے لیے بے پناہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ پہاڑی علاقوں میں قیمتی ادویاتی پودے اور جڑی بوٹیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ سیاحت سوات کی معیشت کا ایک اہم ستون ہے، اور مالم جبہ، کالام، بحرین اور مدین جیسے مقامات ہر سال ہزاروں

سیاحوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ اس کے علاوہ ریشم کی صنعت، دستکاری اور چھوٹی تجارت بھی یہاں کے لوگوں کے روزگار کا ذریعہ ہیں۔ بیرونِ ملک، بالخصوص خلیجی ممالک میں کام کرنے والے اہلِ سوات کی ترسیلاتِ زر بھی یہاں کی معیشت میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

تاہم زیرِ نظر مقالے میں شامل فضلاء جس دور میں عملی زندگی میں داخل ہوئے، وہ سوات کے لیے غیر معمولی آزمائشوں کا دور تھا۔ 2007ء سے 2009ء کے دوران بدامنی اور اس کے بعد ہونے والے فوجی آپریشن کے نتیجے میں لاکھوں افراد کو نقل مکانی کرنی پڑی، کاروبار ٹھپ ہو گئے، سیاحت کا شعبہ تقریباً ختم ہو کر رہ گیا اور تعلیمی ادارے بھی بری طرح متاثر ہوئے۔ اس کے بعد 2010ء اور پھر 2022ء کے تباہ کن سیلابوں نے سڑکوں، پلوں، زرعی زمینوں اور کاروباری مراکز کو شدید نقصان پہنچایا۔ ان حالات کا اثر معاشرے کے ہر طبقے پر پڑا، مگر وہ طبقہ جس کی آمدن پہلے ہی محدود اور غیر یقینی تھی، یعنی دینی خدمات انجام دینے والے علماء، اس سے کہیں زیادہ متاثر ہوا۔ اس پس منظر کو سامنے رکھے بغیر سوات کے فضلاء کی معاشی حالت کا درست تجزیہ ممکن نہیں۔

سوات کے دینی مدارس اور ان کا نظامِ تعلیم:

برصغیر میں دینی مدارس کی تاریخ صدیوں پر محیط ہے، مگر موجودہ صورت میں منظم مدارس کا آغاز 1866ء میں دارالعلوم دیوبند کے قیام سے ہوا، جس کے بعد پورے برصغیر میں اسی طرز کے مدارس کا ایک وسیع جال پھیل گیا۔[34] قیامِ پاکستان کے بعد مدارس کو منظم کرنے کے لیے مختلف مکاتبِ فکر نے اپنے اپنے وفاق قائم کیے، جن میں وفاق المدارس العربیہ پاکستان، تنظیم المدارس اہلِ سنت، رابطۃ المدارس الاسلامیہ اور وفاق المدارس السلفیہ نمایاں ہیں۔[35] یہ وفاق اپنے ملحقہ مدارس کے لیے نصاب، امتحانات اور اسناد کا انتظام کرتے ہیں۔ ان مدارس نے معاشرے کو حفاظِ قرآن، ائمہ، خطباء، مفتیان اور مدرسین کی ایک بڑی تعداد فراہم کی ہے، اور لاکھوں غریب طلبہ کو مفت تعلیم، رہائش اور کھانا مہیا کر کے ایک ایسی سماجی خدمت انجام دی ہے جس کی مثال دنیا کے بہت کم تعلیمی نظاموں میں ملتی ہے۔ دینی مدارس بجا طور پر اسلامی تشخص کے محافظ اور اسلام کے قلعے کہلاتے ہیں۔

ضلع سوات میں بھی دینی تعلیم کا ایک مضبوط اور قدیم نظام موجود ہے۔ یہاں کے معروف مدارس میں جامعہ مظہر العلوم، دارالعلوم الاسلامیہ سیدو شریف، دارالعلوم الاسلامیہ چارباغ، جامعہ دارالقرآن رحیم آباد، جامعہ دارالعلوم مٹہ، جامعہ عمر بن عبدالعزیز، جامعہ اظہار العلوم، جامعہ دارالعلوم سوات، دارالقرآن عثمان آباد اور جامعہ صدیقہ شامل ہیں۔ ان میں سے بعض مدارس سرکاری سرپرستی میں قائم ہوئے جبکہ اکثر عوامی تعاون سے چل رہے ہیں۔ ان مدارس میں حفظ و ناظرہ، تجوید و قراءت، درسِ نظامی، تخصص فی الفقہ اور بعض جگہ عصری تعلیم کے شعبے بھی قائم ہیں۔ ان اداروں نے ایسے جید علماء پیدا کیے جنہوں نے نہ صرف سوات بلکہ پورے ملک میں علمی و دینی

خدمات انجام دیں۔ مولانا فضل حلیم، شیخ الحدیث مولانا بہرہ مند، مفتی نظام الدین شامزئی شہید، مفتی سید محمد منور شاہ سواتی، مولانا عبد اللہ چارباغی اور دیگر کئی نامور علماء کا تعلق اسی سرزمین سے ہے، جن کی تدریسی، تصنیفی اور اصلاحی خدمات کا دائرہ سوات سے نکل کر ملک بھر میں پھیلا۔

ان مدارس کا نصاب بنیادی طور پر درسِ نظامی پر مشتمل ہے جس میں قرآنِ کریم، تفسیر، اصولِ تفسیر، حدیث، اصولِ حدیث، فقہ، اصولِ فقہ، عربی صرف و نحو، عربی ادب، بلاغت، منطق اور علمِ کلام جیسے علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ وفاق المدارس العربیہ کا نصاب مختلف ارتقائی مراحل سے گزرا ہے اور اس میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں بھی کی گئیں، جن میں میٹرک تک عصری مضامین کی شمولیت بھی شامل ہے۔ وفاق کی آخری سند "الشہادۃ العالمیۃ" کو اعلیٰ تعلیمی اداروں میں عربی و اسلامیات کی ماسٹر ڈگری کے مساوی تسلیم کیا جاتا ہے،[36] جس کی بدولت بہت سے فضلاء سرکاری تعلیمی اداروں میں عربی اور اسلامیات کے استاد کی حیثیت سے ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

البتہ یہ نصاب اپنی تمام تر علمی گہرائی کے باوجود طالب علم کو عملی معاشی زندگی، فنی مہارتوں اور کاروباری منصوبہ بندی کے لیے بہت کم تیار کرتا ہے۔ آٹھ سالہ درسِ نظامی کے دوران طالب علم کا پورا وقت متون و شروح کی تدریس میں صرف ہوتا ہے، اور فراغت کے بعد جب وہ عملی زندگی میں قدم رکھتا ہے تو اس کے سامنے روزگار کے محدود راستے ہوتے ہیں: کسی مسجد کی امامت، کسی مدرسے میں تدریس یا کسی سرکاری اسامی کا انتظار۔ مختلف محققین نے اس پہلو کی نشاندہی کی ہے کہ دینی مدارس کے نصاب میں معاشی تربیت کا فقدان فضلاء کے معاشی مسائل کی ایک بڑی وجہ ہے۔[37] یہ صورتِ حال اس اسوہ سے مختلف ہے جو ہم نے سطورِ بالا میں صحابہ کرامؓ اور اسلاف کے حوالے سے دیکھا، جہاں علم اور ہنر دونوں ساتھ ساتھ چلتے تھے۔

فضلاء کے معاشی حالات: میدانی جائزہ:

ضلع سوات کے دینی مدارس سے 2001ء تا 2005ء فارغ ہونے والے فضلاء سے لیے گئے انٹرویوز سے ان کی معاشی زندگی کی جو تصویر سامنے آئی وہ کئی پہلوؤں پر مشتمل ہے۔[38] سب سے پہلا پہلو ذرائعِ آمدن کا ہے۔ فضلاء کی اکثریت کا بنیادی ذریعۂ آمدن امامت، خطابت اور مدارس یا سرکاری و نجی سکولوں میں تدریس ہے۔ بعض فضلاء کو سرکاری ملازمت ملی، بالخصوص محکمۂ تعلیم میں عربی اور اسلامیات کے اساتذہ کی حیثیت سے، اور یہی وہ طبقہ ہے جس کی معاشی حالت نسبتاً مستحکم پائی گئی۔ کچھ فضلاء کا گزارہ زمینداری اور خاندانی وسائل پر ہے، جبکہ چند ایک نے روزگار کی تلاش میں بیرونِ ملک کا رخ کیا۔ امامت و خطابت سے حاصل ہونے والا مشاہرہ عموماً کسی مقررہ ضابطے کے بغیر ہوتا ہے؛ یہ رقم مسجد کی انتظامیہ یا اہلِ محلہ کی صوابدید پر منحصر ہوتی ہے اور اکثر اوقات ایک کنبے کی بنیادی ضروریات کے لیے بھی ناکافی

ثابت ہوتی ہے۔ بعض فضلاء نے بتایا کہ انہیں ایک سے زیادہ ذمہ داریاں سنبھالنی پڑتی ہیں، مثلاً صبح کسی سکول میں پڑھانا، شام کو مدرسے میں درس دینا اور ساتھ ہی امامت کرنا، تب جا کر گھر کا خرچ پورا ہوتا ہے۔

دوسرا پہلو کاروبار کی کوشش کا ہے۔ متعدد فضلاء نے فراغت کے بعد تجارت یا چھوٹے کاروبار کی کوشش کی، جن میں کتب خانے، کپڑے اور کریانے کی دکانیں، زرعی پیداوار کی خرید و فروخت اور اسی نوعیت کے دیگر کام شامل ہیں۔ جن فضلاء نے مستقل مزاجی کے ساتھ کاروبار جاری رکھا وہ نسبتاً بہتر معاشی حالت میں ہیں، اور ان کا کہنا تھا کہ کاروبار نے انہیں دینی خدمات میں زیادہ آزادی اور یکسوئی عطا کی ہے۔ اس کے برعکس سرمائے کی کمی، تجربے کے فقدان، کاروباری رہنمائی نہ ملنے اور علاقے کے مخدوش حالات کی وجہ سے بعض کی کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں۔ کچھ فضلاء نے اس بات کا بھی ذکر کیا کہ معاشرے میں عالمِ دین کے کاروبار کرنے کو بعض اوقات اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا، اور یہ سماجی رویہ بھی ان کے لیے ایک رکاوٹ بنا۔

تیسرا پہلو ماہانہ اخراجات اور معاشی منصوبہ بندی کا ہے۔ انٹرویوز سے معلوم ہوا کہ بیشتر فضلاء کے ماہانہ اخراجات ان کی آمدن کے برابر یا اس سے زیادہ ہیں۔ گھریلو اخراجات، بچوں کی تعلیم، علاج معالجہ، مکان کا کرایہ یا تعمیر اور خوشی غمی کی رسومات وہ بڑے مدات ہیں جن پر آمدن کا بیشتر حصہ خرچ ہو جاتا ہے۔ اکثر فضلاء کے پاس مستقبل کے لیے کوئی باقاعدہ معاشی منصوبہ یا بچت کا نظام موجود نہیں، اور ہنگامی ضرورت کے وقت انہیں قرض لینا پڑتا ہے۔ جو فضلاء کسی نہ کسی درجے میں معاشی منصوبہ بندی کرتے ہیں، مثلاً زمین یا کاروبار میں سرمایہ کاری یا بچوں کو ہنر سکھانا، ان کا مستقبل نسبتاً محفوظ نظر آتا ہے۔

چوتھا پہلو درپیش مسائل کا ہے۔ فضلاء نے جن مشکلات کی نشاندہی کی ان میں مستقل اور باوقار روزگار کا فقدان، دینی خدمات کے مشاہرے کا غیر یقینی ہونا، مہنگائی میں مسلسل اضافہ، فنی و پیشہ ورانہ مہارت کی کمی، سرکاری ملازمتوں میں محدود مواقع اور مقامی سطح پر روزگار کی کمی سرِفہرست ہیں۔ بعض فضلاء نے یہ شکایت بھی کی کہ ان کی سند اور قابلیت کے باوجود انہیں عصری اداروں میں مساوی مواقع نہیں ملتے۔ ان تمام مشکلات کے باوجود یہ پہلو قابلِ تحسین ہے کہ فضلاء کی اکثریت نے قناعت، صبر اور توکل کا دامن نہیں چھوڑا اور دینی خدمات کا سلسلہ جاری رکھا۔ تاہم صبر و قناعت اپنی جگہ ایک بلند اخلاقی صفت ہے، مگر اسے معاشی جدوجہد کے ترک کا بہانہ نہیں بننا چاہیے، کیونکہ اسلام کا تصورِ توکل اسباب اختیار کرنے کے بعد اللہ پر بھروسہ کرنے کا نام ہے۔

فضلاء کا معاشرتی مقام اور کردار:

معاشی مشکلات کے باوجود سوات کے معاشرے میں فضلاء کا معاشرتی مقام نمایاں اور قابلِ احترام ہے۔ انٹرویوز سے معلوم ہوا کہ خاندان والوں کا رویہ عموماً احترام پر مبنی ہے اور خاندانی فیصلوں، مثلاً نکاح، وراثت کی تقسیم اور گھریلو تنازعات میں ان کی رائے کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ پشتون معاشرے میں جرگے کی روایت بہت مضبوط ہے، اور ایسے جرگوں میں عالمِ دین کی موجودگی کو فیصلے کی شرعی حیثیت اور اعتبار کی ضمانت سمجھا جاتا ہے۔ اہلِ علاقہ اپنے ذاتی و اجتماعی مسائل، زمین و جائیداد کے تنازعات اور خاندانی رنجشوں کے حل کے لیے ان سے رجوع کرتے ہیں، اور کئی فضلاء نے بتایا کہ ان کی کوششوں سے پرانی دشمنیاں صلح میں بدل گئیں۔

غیر شرعی رسوم و رواج کے خاتمے میں بھی یہ فضلاء کردار ادا کر رہے ہیں۔ شادی بیاہ کی فضول رسومات، جہیز اور ولیمے میں اسراف، وراثت میں خواتین کی حق تلفی اور غمی کے موقع پر غیر ضروری رسومات جیسے معاملات پر وہ خطبات اور ذاتی ملاقاتوں کے ذریعے اصلاح کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح اہلِ محلہ کی خوشی و غمی میں شرکت، بیماروں کی عیادت، جنازہ و نکاح کی ادائیگی اور بچوں کی دینی تعلیم جیسے کام ان کی معاشرتی حیثیت کو مزید مستحکم کرتے ہیں۔ معاشرے میں لوگوں کی آپس کی رنجشوں اور بدگمانیوں کو دور کرنے میں بھی ان کا کردار نمایاں ہے، کیونکہ عام طور پر لوگ عالمِ دین کو غیر جانبدار اور خیر خواہ سمجھتے ہیں۔

تاہم یہ پہلو بھی سامنے آیا کہ جہاں عالم معاشی طور پر کمزور ہو وہاں اس کی بات کا اثر کم ہو جاتا ہے۔ جو امام اپنی روزی کے لیے مکمل طور پر مسجد کی انتظامیہ یا چند بااثر افراد پر منحصر ہو، وہ بعض اوقات کھل کر حق بات کہنے سے ہچکچاتا ہے، کیونکہ اسے اپنے روزگار کے چھن جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جو فضلاء معاشی طور پر خود کفیل ہیں، وہ معاشرتی اصلاح کے کام میں زیادہ جرأت اور آزادی کے ساتھ حصہ لیتے ہیں۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کی طرف حضرت سفیان ثوریؒ اور حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے اقوال میں اشارہ کیا گیا تھا۔ گویا معاشی استغناء اور معاشرتی اثر و رسوخ ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتے ہیں، اور علماء کی معاشی بہتری درحقیقت پورے معاشرے کی اصلاح کی بہتری ہے۔

معاشی کمزوری کے اسباب اور ان کا حل:

تحقیق کی روشنی میں فضلاء کی معاشی کمزوری کے کئی اسباب سامنے آئے۔ ان میں سب سے پہلا سبب جدید ٹیکنالوجی اور بدلتے ہوئے معاشی تقاضوں سے ناواقفیت ہے۔ آج کی معیشت کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور جدید ذرائع ابلاغ کے گرد گھومتی ہے، اور جو فرد ان سے ناآشنا ہو وہ روزگار کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتا ہے۔ دوسرا سبب فنی و تکنیکی تعلیم کی کمی ہے؛ مدارس کے نصاب میں کسی ہنر یا پیشہ ورانہ مہارت کی تعلیم شامل نہیں،

جس کی وجہ سے فاضل کے پاس دینی خدمات کے سوا روزگار کا کوئی متبادل راستہ نہیں ہوتا۔ تیسرا سبب نظامِ تعلیم کی دوئی ہے؛ دینی اور عصری تعلیم کے درمیان ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے مدارس کے فضلاء عصری اداروں اور منڈی کی ضروریات سے کٹے رہتے ہیں۔

چوتھا سبب معاشرے کا غیر منصفانہ رویہ ہے۔ دینی خدمات کو معاوضے کے لحاظ سے کم تر سمجھا جاتا ہے، اور جو معاشرہ اپنے بچوں کے سکول کی فیس اور دیگر اخراجات پر بے دریغ خرچ کرتا ہے، وہی مسجد کے امام کے مشاہرے میں اضافے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ پانچواں سبب خود فضلاء میں پائی جانے والی غیر مستقل مزاجی ہے؛ بعض فضلاء کاروبار شروع کر کے ابتدائی مشکلات کے بعد جلد ہمت ہار دیتے ہیں۔ چھٹا سبب روزگار کے مواقع کی غیر منصفانہ تقسیم ہے، کیونکہ سوات جیسے علاقوں میں صنعت و حرفت کم اور سرکاری ملازمتیں محدود ہیں۔ ساتواں سبب والدین اور سرپرستوں کی غفلت ہے، جو دورانِ تعلیم ہی بچوں کی معاشی تربیت اور کسی ہنر کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ ان کے علاوہ علاقے میں بدامنی اور قدرتی آفات نے بھی معاشی مشکلات میں اضافہ کیا۔

معاشی بدحالی کے اثرات صرف فرد تک محدود نہیں رہتے بلکہ پورے معاشرے پر مرتب ہوتے ہیں۔ معاشی پریشانی عالم کی ذہنی یکسوئی چھین لیتی ہے، اس کی علمی و تحقیقی صلاحیتیں ماند پڑ جاتی ہیں، اور وہ دعوت و اصلاح کا فریضہ پوری آزادی سے انجام نہیں دے پاتا۔ مزید برآں نئی نسل جب اہلِ علم کی معاشی مشکلات دیکھتی ہے تو دینی تعلیم کی طرف اس کا رجحان کمزور پڑ جاتا ہے، جس کا نقصان بالآخر پورے دینی نظام کو پہنچتا ہے۔ اس کے برعکس معاشی خوشحالی معاشرے میں امن، سکون اور اطمینان کی فضا پیدا کرتی ہے اور عالم کو وہ وقار عطا کرتی ہے جو اس کے منصب کے شایانِ شان ہے۔

ان مسائل کے حل کے لیے چند قابلِ عمل تجاویز پیش کی جاتی ہیں۔ سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ مدارس کے نصاب میں درسِ نظامی کی علمی روح کو برقرار رکھتے ہوئے مختصر فنی و پیشہ ورانہ کورسز شامل کیے جائیں، مثلاً کمپیوٹر، حسابات، تجارت، زراعت، طبِ یونانی، خطاطی اور دستکاری، تاکہ ہر فاضل کے پاس کم از کم ایک ہنر موجود ہو۔ اسی طرح آخری درجات کے طلبہ کو "فقہ المعاملات" اور اسلامی تجارت کی عملی تربیت دی جائے تاکہ وہ حلال کاروبار کی سمجھ کے ساتھ میدانِ عمل میں اتریں اور معاشرے کو بھی جدید معاشی معاملات میں شرعی رہنمائی فراہم کر سکیں۔ مساجد کی انتظامیہ، اوقاف اور حکومت کو چاہیے کہ ائمہ و خطباء کے لیے باقاعدہ اور باوقار مشاہرے کا ضابطہ مقرر کریں، جس میں مہنگائی کے تناسب سے سالانہ اضافہ بھی شامل ہو، جیسا کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے واقعے میں امت کی خدمت کے لیے وقف شخص کی کفالت کا اصول طے ہوا تھا۔

اسی طرح اسلامی بینکاری کے ادارے اور مخیر حضرات قرضِ حسنہ کی بنیاد پر فضلاء کو چھوٹے کاروبار کے لیے بلا سود سرمایہ فراہم کریں، اور مدارس اپنے فضلاء کی تنظیمیں (ابنائے قدیم کی انجمنیں) قائم کریں جو روزگار، کاروباری رہنمائی اور باہمی تعاون کا ذریعہ بنیں۔ سرکاری تعلیمی اداروں میں عربی و اسلامیات کی آسامیوں پر اہل فضلاء کی تقرری کے مواقع بڑھائے جائیں اور مدارس کی اسناد کو عملی طور پر مساوی حیثیت دی جائے۔ والدین کو بھی چاہیے کہ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں کو کسی ہنر یا کاروبار سے روشناس کرائیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ فضلاء خود بھی سلف صالحین کے طرز پر کسبِ حلال کو عار سمجھنے کے بجائے سنت سمجھ کر اختیار کریں، مستقل مزاجی سے کام لیں اور حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ کی طرح "مجھے بازار کا راستہ بتادو" کا جذبہ اپنے اندر پیدا کریں۔

خلاصۂ بحث:

اس مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلام نے کسبِ حلال کو نہ صرف جائز بلکہ عبادت کا درجہ دیا ہے، اور انبیاء کرام علیہم السلام، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرامؓ اور ائمہ مجتہدین کی زندگیاں علم اور معاشی خود کفالت کے حسین امتزاج کی روشن مثالیں ہیں۔ اسلاف نے معاشی استغناء کو علم کی آزادی اور حق گوئی کا ضامن سمجھا اور خود محنت کر کے اہلِ علم کی کفالت بھی کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ دینی مدارس سے فارغ ہونے والے فضلاء معاشرے میں ایک باوقار مقام رکھتے ہیں اور تنازعات کے حل، غیر شرعی رسوم کے خاتمے، خاندانی فیصلوں اور اجتماعی رہنمائی میں نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں، مگر ان کی ایک بڑی تعداد معاشی عدمِ استحکام کا شکار ہے۔ اس کی بنیادی وجوہات فنی مہارت کی کمی، نصاب میں معاشی تربیت کا فقدان، دینی خدمات کے مشاہرے کا غیر منظم نظام، مقامی روزگار کے محدود مواقع اور علاقے کے مخدوش حالات ہیں۔ اگر مدارس، حکومت، مساجد کی انتظامیہ، اہلِ خیر اور خود فضلاء مل کر مذکورہ تجاویز پر عمل کریں تو علماء کرام معاشی طور پر خود کفیل ہو کر پوری ذہنی یکسوئی کے ساتھ دین اور معاشرے کی خدمت کا فریضہ بہتر انداز میں انجام دے سکیں گے، اور یوں معاشرہ حقیقی معنوں میں اسلامی خطوط پر استوار ہو سکے گا۔

---

[1] القرآن، الزمر 39:9

[2] القرآن، فاطر 35:28

[3] ابو داؤد، سلیمان بن اشعث، السنن، کتاب العلم، باب الحث علی طلب العلم، حدیث: 3641

[4] القرآن، الاعراف 7:10

[5] ابن خلدون، عبد الرحمٰن بن محمد، مقدمہ ابن خلدون، طبع: دار الفکر، بیروت، 1988ء، الباب الخامس، الفصل الاول

[6] Adam Smith, An Inquiry into the Nature and Causes of the Wealth of Nations (London: W. Strahan and T. Cadell, 1776), Book IV, Introduction.

[7] Alfred Marshall, Principles of Economics (London: Macmillan, 1890), Book I, Chapter 1.

[8] القرآن، الجمعہ 62:10

[9] القرآن، الملک 67:15

[10] القرآن، النجم 53:39

[11] القرآن، ہود 11:37

[12] القرآن، سبا 34:10-11

[13] القرآن، القصص 28:27

[14] البخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، کتاب البیوع، باب کسب الرجل وعملہ بیدہ، حدیث: 2072

[15] الترمذی، محمد بن عیسیٰ، السنن، ابواب البیوع، باب ماجاء فی التجار، حدیث: 1209

[16] البخاری، الجامع الصحیح، کتاب الزکاۃ، باب الاستعفاف عن المسألۃ، حدیث: 1471

[17] البخاری، الجامع الصحیح، کتاب الزکاۃ، باب لاصدقۃ الا عن ظہر غنی، حدیث: 1427

[18] ابوداؤد، السنن، کتاب الزکاۃ، باب ما تجوز فیہ المسألۃ، حدیث: 1641

[19] القرآن، البقرہ 2:275

[20] القرآن، الاعراف 7:31

[21] القرآن، الحشر 59:7

[22] سیوہاروی، مولانا حفظ الرحمٰن، اسلام کا اقتصادی نظام، طبع: ندوۃ المصنفین، دہلی

[23] شاہ ولی اللہ، احمد بن عبد الرحیم، حجۃ اللہ البالغہ، القسم الاول، مبحث الارتفاقات

[24] البخاری، الجامع الصحیح، کتاب الاجارۃ، باب رعی الغنم علی قراریط، حدیث: 2262

[25] ابن ہشام، عبد الملک، السیرۃ النبویۃ، باب حدیث تزویج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدیجۃ

[26] ابن سعد، محمد، الطبقات الکبریٰ، ترجمہ: ابو بکر الصدیقؓ

[27] البخاری، الجامع الصحیح، کتاب البیوع، باب ماجاء فی قول اللہ تعالیٰ: فاذا قضیت الصلاۃ، حدیث: 2048

[28] الغزالی، ابو حامد محمد، احیاء علوم الدین، کتاب آداب الکسب والمعاش، الباب الاول

[29] الخطیب البغدادی، احمد بن علی، تاریخ بغداد، ترجمہ: النعمان بن ثابت ابو حنیفہ

[30] الخطیب البغدادی، تاریخ بغداد، ترجمہ: عبد اللہ بن المبارک

[31] ابو نعیم الاصبہانی، احمد بن عبد اللہ، حلیۃ الاولیاء، ترجمہ: سفیان الثوری

[32] گیلانی، سید مناظر احسن، سوانح قاسمی، طبع: مکتبہ دار العلوم دیوبند

[33] Sultan-i-Rome, Swat State (1915–1969) from Genesis to Merger (Karachi: Oxford University Press, 2008).

[34] Barbara Daly Metcalf, Islamic Revival in British India: Deoband, 1860–1900 (Princeton: Princeton University Press, 1982).

[35] وفاق المدارس العربیہ پاکستان، تعارف ونظام، ملتان

[36] ہائر ایجوکیشن کمیشن پاکستان، دینی مدارس کی اسناد (الشہادۃ العالمیۃ) کی مساوات سے متعلق ضوابط

[37] Muhammad Qasim Zaman, The Ulama in Contemporary Islam: Custodians of Change (Princeton: Princeton University Press, 2002).

[38] مقالہ نگار، "ضلع سوات کے دینی مدارس سے فارغ التحصیل فضلاء (2001 تا 2005) کے معاشی و معاشرتی حالات کا تجزیاتی مطالعہ"، غیر مطبوعہ مقالہ ایم فل، باب چہارم (انٹرویوز)